کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ

قرآن اور سائنس

(وہ نکتہ جس میں ملتِ اسلامیہ کی زندگی اور ارتقاء کا راز پوشیدہ ہے، اور جس کے خلاف عالمگیر سازش ہو رہی ہے)

تقریب جشنِ نزولِ قرآن کے موقع پر پرویز صاحب کا خطاب

عزیزانِ گرامی قدر، سلام ورحمت!

یوں تو ہمارا ہر درس، قرآنِ مجید ہی کا درس ہوتا ہے، لیکن آج کے درس کا تعلق جس عظیم القدر تقریب کے ساتھ ہے، اس سے اس کی اہمیت اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ دنیا کی ہر قوم اور اہلِ مذاہب سال میں کچھ دن بطور تیوہار مناتے ہیں لیکن وہ تیوہار بہرحال انسانوں کے اپنے متعین کردہ ہوتے ہیں۔ یہ خصوصیت ۔۔۔ اسلام کو حاصل ہے کہ اس کے تیوہار کا نہ صرف تعین، خود خدا نے کیا ہے بلکہ اس کے منانے کا خاص طور پر حکم بھی دیا ہے۔ اس سے اس تیوہار کی اہمیت اور عظمت واضح ہے۔ آج کا درس اسی تیوہار کے ساتھ مختص ہے ــــ سورۂ یونس میں ہے: يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ (10:57) "اے نوعِ انسان! تمہاری طرف تمہارے نشوونما دینے والے کی جانب سے ایک ضابطۂ قوانین نازل ہوا ہے جو تمہارے نفسیاتی امراض کے لئے نسخۂ شفا ہے۔" وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٧﴾ اور ان لوگوں کے لیے جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھیں، سامانِ نشوونما اور منزلِ انسانیت تک پہنچنے کی راہنمائی ہے۔" اس قدر گراں بہا عطیہ کے بعد فرمایا: قُلْ بِفَضْلِ اللهِ وَبِرَحْمَتِهِ ۔۔۔ "اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ یہ محض خدا کے فضل و رحمت سے ہے کہ تمہیں ایسا عدیم

النظیر ضابطۂ حیات مل گیا ہے۔ ایسا بے نظیر ضابطۂ حیات کہ اگر ساری دنیا کے انسان مل کر بھی کوشش کرتے تو اس کے ایک جزو جیسا ضابطہ بھی مرتب نہ کر سکتے۔ لہٰذا، فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ ۔۔۔ "تمہیں چاہیئے کہ ایسی متاعِ گراں بہا کے اس طرح بے مزد و معاوضہ مل جانے پر جشنِ مسرت مناؤ" ــــ وہ متاعِ گراں بہا کہ ۔۔۔ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾ (10:58) "انسان جو کچھ اور جتنا کچھ بھی جمع کرے یہ اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔" ــــ ساری متاعِ کائنات سے زیادہ گراں بہا۔ تمام سامانِ زیست سے زیادہ بیش قیمت۔

یہ ہے وہ تقریبِ جاں نواز جسے بطورِ جشنِ مسرت منانے کا حکم خدا نے دیا ہے۔ یعنی جشنِ نزولِ قرآن۔ نزولِ قرآن کریم کا آغاز چونکہ رمضان کے مہینے میں ہوا تھا (2:185) اس لئے رمضان کا پورا مہینہ گویا اس جشن کی تیاریوں کا تھا اور عید الفطر اس کی تکمیل کا دن۔ ہم لوگ چونکہ قرآن کی ہر حقیقت کو فراموش کر چکے ہیں اس لئے ہم میں سے شاید ہی کسی کو علم ہو کہ یہ عید کیا ہے اور ہم اسے کیوں مناتے ہیں۔ اب یہ محض ایک رسم ہے جسے روایتاً ادا کرلیا جاتا ہے ــــ مذہب پرست طبقہ کے نزدیک ثواب حاصل کرنے کے لیے، اور عوام کے نزدیک سیویاں کھانے کے لیے۔۔۔ اور اب تو وہ بھی ان بیچاروں کی دسترس سے باہر ہو چکی ہیں ــــ ان کے لئے سیویاں اور ان کے معصوم بچوں کے لیے کھلونے! اقبالؒ نے تو ساٹھ ستر برس پہلے یہ آہ کھینچی تھی کہ ؎

اے بادِ صبا! کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا!
قبضے سے اُمت بیچاری کے، دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

اس میں تمہارا ذکر ہے:

اور عید کا چاند دیکھ کر کہا تھا کہ ــــ ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے ــــ وہ آج زندہ ہوتا تو ہماری حالت دیکھ کر نمعلوم کس طرح خود بھی تڑپتا اور ہمیں بھی تڑپاتا ــــ یہ اس قوم کی حالت ہے جسے قرآن جیسا ضابطۂ زندگی عطا کرنے کے بعد کہا تھا کہ: لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰﴾ (21:10) "یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں خود تمہارا ذکر ہے۔ کیا تم اس بلند حقیقت پر غور نہیں کرتے؟" عربی زبان

میں لفظ ذکر کے ایک معنی تو وہی ہیں جو ہمارے ہاں مروج ہیں۔اس اعتبار سے اس آیۂ جلیلہ کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن خود انسان کا ترجمان ہے۔علامہ اقبالؒ نے خدا کو مخاطب کرتے ہوئے اس حقیقت کو اس حسین انداز سے بیان کیا تھا کہ ؎

محمدؐ بھی ترا، جبریلؑ بھی، قرآن بھی تیرا!

مگر یہ حرفِ شیریں، ترجماں تیرا ہے یا میرا؟

لیکن اس لفظ (ذکر) کے ایک اور معانی بھی ہیں۔یعنی شرف وعظمت،عزت وتوقیر،ان معانی کی رو سے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس کتاب میں خود تمہارے شرف واجتباء کا راز پوشیدہ ہے۔ یہ اس لئے بھیجی گئی ہے کہ تمہیں عزت وتوقیر کا مقامِ بلند عطا کردے۔اسی لئے دوسرے مقام پر کہا کہ بَلۡ اَتَيۡنٰهُمۡ بِذِكۡرِهِمۡ فَهُمۡ عَنۡ ذِكۡرِهِمۡ مُّعۡرِضُوۡنَؕ﴿۷۱﴾ (23:71) ہم انہیں شرف ومجد کا مقام عطا کرنا چاہتے ہیں اور ان کی حماقت دیکھو کہ یہ خود اپنی ہی عزت واحترام سے اعراض برتتے ہیں۔اس سے روگردانی کرتے ہیں۔یہ اس لئے کہ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا﴿۷۲﴾ (33:72)''حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی ظالم اور جاہل واقع ہوا ہے۔'' یہ جہالت کی بنا پر خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ہم،قرآن کی حامل قوم،اسی مقام پر ہیں۔ساری دنیا میں ذلیل وخوار۔

مادی اور روحانی دُنیا:

قرآنِ کریم نے اپنی منفرد خصوصیات کی بنا پر تمام نوعِ انسان کو یہ چیلنج دیا ہے کہ وہ اس کی مثل ضابطۂ حیات مرتب کرکے دکھائیں۔یہ خصوصیات بکثرت ہیں اور کسی ایک نشست میں ان کا احاطہ ممکن نہیں۔میں آج کی تقریب میں اس کی صرف ایک خصوصیت پر اکتفا کروں گا جسے عصرِ حاضر میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔دنیا کے کسی مذہب کو لیجئے اس نے انسانی زندگی، بلکہ جملہ تخلیقِ خداوندی کو دو حصوں میں میں تقسیم کر رکھا ہے۔یعنی مادی (Material) اور روحانی (Spiritual)۔یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد اور معاند ہیں۔ ایسے معاند کہ، نہ صرف یہ کہ یہ یک جا اکٹھے نہیں ہوسکتے اہل مذہب، مادیت کو انتہائی قابلِ نفرت

قرار دیتے ہیں اور مذہب کا سخت دشمن۔ دوسری طرف اہلِ مادیت (جنہیں آج کل کی اصطلاح میں سائنٹسٹ کہہ لیجئے) مذہب کو جہالت اور توہم پرستی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان دونوں میں جنگ، قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ عصرِ حاضر کی سیکولرازم، مذہب کے خلاف اسی نفرت کا نتیجہ ہے۔ وہ مذہب کا نام تک لینا پسند نہیں کرتے۔

کائناتی شواہد:

لیکن قرآنِ کریم کی منفرد خصوصیت کو دیکھئے کہ وہ (یوں کہئے کہ) مذہب کے اسٹیج پر کھڑا ہو کر، مادی کائنات کے نظام کو اپنی صداقت کی تائید میں بطورِ شہادت پیش کرتا ہے۔ قرآنی تعلیم کا بنیادی نکتہ قانون کی عمل داری (Rule of Law) ہے۔ اس کا منتہیٰ اور مقصود تو انسانی دنیا میں قانونِ خداوندی کی حاکمیت ہے لیکن چونکہ قانون کی حاکمیت، خارجی کائنات کے محسوس پیکروں میں نہایت آسانی سے سامنے آ جاتی ہے، اس لئے وہ انہیں قرآنی دعاوی کی تائید میں بطور شواہد پیش کرتا ہے۔ (مثلاً) سورۂ واقعہ میں ہے: فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ ۔۔۔(56:75) ''نہیں! بات یہ نہیں کہ میں اپنے دعاوی کے ثبوت میں نظری دلائل یا بسیط حقائق (Abstract Realities) پیش کر کے آگے بڑھ جاؤں گا۔ میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ نظری یا تجریدی دلائل عام فہم نہیں ہوتے۔ میں کائنات کے مرئی اور محسوس نظام کی مثالوں سے واضح کروں گا کہ یہ تمام نظام کس طرح قوانین کے تابع مصروفِ گردش ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ستاروں کی گذرگاہوں کو بطور شہادت پیش کرتا ہوں وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ (56:76) ''اور اگر تم علم و بصیرت کی بارگاہ سے دریافت کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ شہادت کس قدر محکم اور پائیدار ہے۔''

ہم شہروں کے رہنے والے ستاروں کی گزرگاہوں کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس کے متعلق پوچھئے صحرانورد بدوؤں سے جن کی ساری زندگی سفر میں گزرتی تھی اور سفر بھی بیشتر رات کی تاریکی میں، اُس صحرا میں جہاں نہ کوئی نشانِ راہ ہوتا تھا، نہ دلیلِ منزل۔ ان حالات میں ان کے سفر کی راہنمائی صرف ستاروں کی گذرگاہوں سے ہوتی تھی۔ وہ ان سے راستہ کا تعین کرتے تھے اور انہیں اس کا عملی یقین ہوتا تھا کہ وہ نہ راستہ بتانے میں کبھی غلطی کریں گے، نہ منزل کی

طرف لے جانے میں فریب دیں گے۔ آج بھی ان گزرگاہوں کی اہمیت جہاز رانوں اور علم الافلاک کے محققین سے دریافت کی جاسکتی ہے۔ ان گذرگاہوں کو بطورِ شہادت پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ: اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ ﴿۷۷﴾ (56:77) جس طرح یہ ستارے تمہیں منزلِ مقصود تک پہنچانے میں چراغِ راہ بنتے ہیں، اور اس میں کبھی دھوکا نہیں دیتے۔ اسی طرح یہ قرآن بھی انسانی زندگی کے سفر میں تمہاری راہنمائی کرے گا اور اس میں یہ غلطی کرے گا نہ دھوکا دے گا۔

سورۂ تکویر میں اس اجمال کو قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جہاں کہا کہ: فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الْجَوَارِ الْکُنَّسِ ﴿۱۶﴾ (16-81:15) ''یہی نہیں۔ بلکہ میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ان سیاروں کو جو پچھلے پاؤں لوٹ جاتے ہیں، اور انہیں بھی جو برق رفتار غزالہ کی طرح تیزی سے آگے بڑھ کر نگاہوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔'' وَالَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾ (18-81:17) ''اور شہادت میں پیش کرتا ہوں لیلائے شب کو جب وہ دبے پاؤں آتی ہے اور اسی طرح خاموشی سے لوٹ جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی عذرائے سحر کو جب وہ اپنی مسیحا نفسی سے ساری دنیا کو حیاتِ نو کا پیغام دینے، مشرق کے جھروکے سے نمودار ہوتی ہے۔ میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ان تمام کائناتی شواہد کو اس حقیقت کی تصدیق کے لئے کہ: اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ ﴿۱۹﴾ (81:19) ''جس شخص کی زبان سے تم اس، قرآن کو سن رہے ہو، وہ یہ کچھ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔ وہ تو ہمارا قاصد ہے، اور ہمارا پیغام تم تک پہنچا رہا ہے۔ وہ قاصد نہایت واجب التکریم ہے، اور یہ پیغام بھی واجب التکریم (56:77) اور جس خدا نے اسے بھیجا ہے وہ بھی واجب التکریم (23:116)''

سورۂ الطارق میں ہے: وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴿۱۱﴾ (86:11) ''یہ فضائی کرے جو اس قدر عظیم الجثہ ہونے کے باوجود اس حسن وخوبی سے اپنے اپنے مدار میں مصروفِ گردش ہیں'' (36:40) اور اپنی گردش سے زندگی کے نئے نئے پہلو سامنے لاتے ہیں، وہ بھی اس حقیقت پر شاہد ہیں اور یہ زمین بھی جو بیج کو پھاڑ کر اس میں سے ایک کونپل کی شکل میں ایک نئی زندگی کی نمود کرتی ہے (وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴿۱۲﴾ (86:12)) یہ سب اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ ــــ اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿۱۳﴾ (86:13) ''یہ قرآن ایک فیصلہ کن حقیقت ہے۔ اس

میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ غلط اور صحیح، حق اور باطل کو، نکھار کر الگ الگ کر دیتا ہے۔'' وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿١٤﴾۔۔۔(86:14) ''یہ یونہی مذاق نہیں۔تم کہتے ہو کہ یہ شاعری ہے جسے زمانے کی گردشیں خود بخود مٹا دیں گی۔'' اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ ﴿٣٠﴾(52:30) ''یہ بھی تمہارا واہمہ ہے۔'' فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٣٩﴾(69:39-38) ''جو کچھ تمہیں دکھائی دیتا ہے۔یعنی یہ عالمِ محسوس۔اور جو کچھ تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہے'' وہ سب اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ ﴿٤٠﴾ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ (69:41-40) ''یہ قرآن ایک واجب التکریم قاصد کی وساطت سے پہنچنے والا ابدی حقائق کا مجموعہ ہے۔یہ شاعرانہ تخیلات کا نگاہ فریب مرقع نہیں جو مرورِ زمانہ سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جایا کرتے ہیں۔''

قرآنِ کریم میں بکثرت مقامات ہیں جہاں نظامِ کائنات اور اس کے عناصر کو قرآنی حقائق اور دعاوی کی تائید میں بطورِ شہادت پیش کیا گیا ہے۔نظامِ کائنات کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے تمام رموز واسرار بیک وقت سامنے نہیں آجاتے۔جوں جوں علمِ انسانی ترقی کریگا اور محققین کی کاوشیں ان پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھاتی جائیں گی۔یعنی انہیں (Discover) بے نقاب کرتی جائیں گی، یہ اُبھر کر سامنے آتے جائیں گے۔اس بنا پر قرآن نے کہا ہے کہ:

سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ اَوَلَمْ یَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿٥٣﴾(41:53)

ہم عالمِ انفس وآفاق۔یعنی انسان کی خود اپنی زندگی اور خارجی کائنات میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے اور ہر حقیقت جو اس طرح بے نقاب ہوگی اس امر کی شہادت پیش کرے گی کہ قرآن کا ہر دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے۔یہ اس لئے کہ یہ قرآن اس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے کہ تمام مستور حقائق اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔وہ تمہاری نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں، اس سے نہیں۔

اس آیۂ جلیلہ میں قرآنِ کریم نے عظیم حقائق کو پیش کیا ہے۔اس نے اربابِ علم ودانش کو

تاکید کی ہے کہ وہ رموزِ فطرت دریافت کرنے میں مسلسل کوشش کرتے رہیں اور دوسرے اس نے یہ کہا ہے کہ قرآنِ کریم کے احکام واوامر تو ہر دور میں واضح طور پر سامنے رہیں گے، لیکن اس کے حقائق ومعارف تمام کے تمام کسی ایک دور میں منکشف نہیں ہوجائیں گے۔ علمِ انسانی کی سطح جوں جوں بلند ہوگی رفتہ رفتہ بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ اس لئے یہ ہر زمانے کے اربابِ علم کے لئے موضوعِ تحقیق وہدفِ کاوش رہے گا۔ اس کا حرفِ آخر، آخری دور کے انسان کے لئے چھوڑا گیا ہے۔ لہٰذا کسی دور کے انسانوں کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہوگا کہ قرآنی حقائق کے متعلق جو کچھ سمجھا جاتا تھا، سمجھا جاچکا ہے۔ اب اس میں فکر وتدبر کے لئے کچھ باقی نہیں رہا۔

مومنین کا شیوہ:

نظامِ کائنات کی یہی اہمیت ہے جس کے پیشِ نظر اس نے علمی تحقیقات پر اس قدر زور دیا ہے۔ (مثلاً) سورۂ آلِ عمران میں ہے:

وَلِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۸۹﴾ اِنَّ فِىۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾ (3:189-190)

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ عقل وبصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لئے تخلیقِ کائنات اور گردشِ لیل ونہار میں قوانینِ خداوندی کی حقیقت اور ہمہ گیری کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں ان صاحبانِ عقل وبصیرت اور اربابِ فکر ونظر کے لئے جو زندگی کے ہر گوشے میں، کھڑے بیٹھے لیٹے، قوانینِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کی تخلیقی ترکیب پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیقات اور انکشافات کے بعد علیٰ وجہ البصیرت پکار اُٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگہٗ کائنات کو نہ تو عبث وبے کار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لیے۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو اتنے عظیم نظام کو بلا مقصد پیدا کردے۔ یہ ہماری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ ہم تحقیق

سے کام نہیں لیتے اور اس طرح اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں
سے بے خبر رہ کر عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تو ہمیں توفیق عطا فرما
کہ ہم علمی تحقیقات اور عملی تجربات کے بعد عناصرِ کائنات سے صحیح صحیح
فائدہ اٹھائیں اور اس طرح تباہ کن عذاب کی زندگی سے محفوظ رہیں۔

علماء کون ہیں؟

ہمارے ہاں جن حضرات کو 'علماء کرام'' کہا جاتا ہے، قوانینِ فطرت کے متعلق ان کے مبلغِ علم کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن دیکھئے کہ قرآن مجید، علماء کن لوگوں کو قرار دیتا ہے۔ سورۂ فاطر میں ہے: اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهَا ؕ ۔۔۔(35:27) تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ بادلوں سے ایک جیسا پانی برستا ہے لیکن اس سے مختلف انواع واقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ سب پھل اور فصلیں ایک جیسی ہوں۔'' ۔۔۔وَمِنَ الۡجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيۡضٌ وَّحُمۡرٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهَا وَغَرَابِيۡبُ سُوۡدٌ ﴿۲۷﴾ (35:27) ''اور پہاڑوں کو دیکھو کہ ان کا مادۂ تخلیق ایک ہی تھا لیکن ان میں مختلف رنگوں کے خطے ہیں ــــ کوئی سفید، کوئی سرخ، کوئی کالا بھجنگ۔'' (اور ہر خطہ اپنے اندر ارتقائی منازل کی داستانیں مرقوم و محفوظ رکھے ہوئے ہے)۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالۡاَنۡعَامِ مُخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ ۔۔۔(35:28) ''اسی طرح انسان اور دیگر حیوان اور مویشی بھی مختلف النوع ہیں۔''

آپ غور کیجئے کہ علومِ سائنس کے مختلف شعبے ان آیات کے اندر آ گئے ہیں۔ اس کے بعد کہا کہ صحیفۂ فطرت کے یہ اوراق جو قوانینِ خداوندی کی زندہ شہادت ہیں، سب کے سامنے کھلے رہتے ہیں، لیکن ان ۔۔۔ قوانین کی عظمت کے سامنے وہی جھکتے ہیں جو ان پر علم و بصیرت کی رُو سے غور کرتے ہیں۔ اِنَّمَا يَخۡشَى اللّٰهَ مِنۡ عِبَادِهِ الۡعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ غَفُوۡرٌ ﴿۲۸﴾ (35:28) ''یہی لوگ ہیں جو علماء کہلانے کے مستحق ہیں اور یہی جان سکتے ہیں کہ خدا کا قانون کس قدر غلبہ کا مالک ہے اور جو لوگ ان کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں، وہ انہیں کس قدر سامانِ حفاظت عطا کر دیتا ہے۔'' (نیز 24-30:22)۔ آپ غور کیجئے کہ جن لوگوں کو قرآنِ

کریم نے علماء کہا ہے، کیا وہ وہی نہیں جنہیں دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں سائنٹسٹ کہا جاتا ہے؟

تسخیرِ کائنات:

قرآنِ کریم نے، نظامِ کائنات، پر غور و فکر کی محض نظری طور پر تاکید ہی نہیں کی۔ اس نے کہا ہے کہ:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ⑬ (45:13)

اللہ تعالیٰ نے اپنے قوانین کی رُو سے، کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (یعنی جملہ کائنات) کو تمہارے لیے تابع تسخیر کر دیا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو وہی لوگ سمجھ سکیں گے جو غور و فکر سے کام لیں گے۔

اس نے کہا یہ ہے کہ قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرنا اس لئے ضروری ہے کہ تم اس سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر سکو گے۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن نے جو شروع ہی میں کہا تھا کہ اس میں خود تمہارے لئے شرف و مجد کا راز پوشیدہ ہے، تو وہ دعویٰ کس قدر صداقت پر مبنی ہے۔ جو قومیں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیتی ہیں، انہیں کس قدر قوت اور ثروت حاصل ہو جاتی ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اُمتِ مسلمہ کے لئے یہ چیزیں، شرف و مجد کا صرف ایک پہلو ہیں۔ اس کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں قرآن کی ابدی اقدار کے مطابق صرف میں لایا جائے۔ (اس کے متعلق تفصیل سے بعد میں گفتگو کی جائے گی)

علامہ اقبالؒ نے قصہٴ آدم کو اپنے تمثیلی انداز میں بڑے خوبصورت اسلوب سے پیش کیا ہے، آدم فرشتوں کے جلو میں زمین کی طرف آتا ہے تو روحِ ارضی یہ کہہ کر اس کا استقبال کرتی ہے کہ:

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ!
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں!
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں

تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!
خورشیدِ جہاں تاب کی ضَو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں!
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ!
(بالِ جبریل،ص:178)

عقل وفکر سے کام نہ لینے والے:

خارجی کائنات سے آگے بڑھ کر، اب خود انسان کی طرف آیئے، قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر بتایا ہے کہ انسان، حیوانات سے اشرف اور ممتاز اس لئے ہے کہ اسے غور وتدبر، عقل وفکر، علم وبصیرت کی صلاحیت دی گئی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ انسان کے حیطۂ علم وبصیرت سے صرف ایک چیز باہر ہے اور وہ ہے وحی کی کنہ وحقیقت۔ یعنی یہ کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو وحی کس طرح ملتی تھی اور اس کا سرچشمہ کیا تھا۔ صرف یہ چیز عقلِ انسانی سے ماوراء ہے۔ عقلِ انسانی نہ وحی کی تخلیق کرسکتی ہے، اور نہ یہ جان سکتی ہے کہ نبی کو وحی ملتی کس طرح تھی۔ اس کے بعد، جب حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی وساطت سے، وحی انسانوں تک پہنچ جاتی تھی، تو اسے غور وفکر اور علم وبصیرت کی رُو سے سمجھا جاسکتا تھا۔ قرآنِ کریم نے علم وعقل اور فکر وبصیرت کی اہمیت پر اس قدر زور دیا ہے کہ اس کی تفصیل میں جانے کے لیے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہوگی۔ وہ عقل وفکر سے کام نہ لینے والوں کو جہنمی قرار دیتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے: **وَلَقَدۡ ذَرَاۡنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ** ۖ (7:179) صحرائی اور شہری آبادیوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کا اندازِ زیست زبانِ حال سے بتاتا ہے کہ یہ جہنمی مخلوق ہے۔۔۔ **لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ بِهَا ۚ وَلَهُمۡ اَعۡيُنٌ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ بِهَا ۚ وَلَهُمۡ اٰذَانٌ لَّا**

يَسۡمَعُوۡنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ ؕ ۔۔۔(7:179) ''یہ وہ لوگ ہیں جو سینوں میں دل تو رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وہ ماتھے پر آنکھیں بھی رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ لوگ دیکھنے میں تو انسان نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت حیوان ہوتے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔۔۔''

سورۂ انفال میں ہے: اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الۡبُكۡمُ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۲۲﴾ (8:22) ''خدا کے نزدیک، بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں یعنی وہ لوگ جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ سورۂ الملک میں ہے کہ جہنم کا داروغہ جہنم میں داخل ہونے والوں سے پوچھے گا کہ تم نے کیا کیا تھا جس کی وجہ سے تم جہنم میں داخل کئے جارہے ہو؟ وہ جواب میں کہیں گے کہ وَقَالُوۡا لَوۡ كُنَّا نَسۡمَعُ اَوۡ نَعۡقِلُ مَا كُنَّا فِىۡۤ اَصۡحٰبِ السَّعِيۡرِ ﴿۱۰﴾ (67:10) ''اگر ہم سچی بات دل کے کانوں سے سنتے اور عقل وفکر سے کام لیتے تو اہلِ جہنم میں سے نہ ہوتے۔'' عقل وفکر سے کام نہ لینا ہے جس کی وجہ سے ہم جہنم میں دھکیلے جارہے ہیں۔ سورۂ حم میں ہے کہ قرآن تو ہے ہی ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔ كِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰيٰتُهٗ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۳﴾ (41:3) ''قرآن واضح عربی زبان کی کتاب ہے جس کے احکام وحقائق نکھار کر بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ اس قوم کے لئے ہے جو علم وعقل سے کام لے۔'' یہ تو آپ پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن، علم کسے قرار دیتا ہے اور علماء کن لوگوں کو کہتا ہے۔

قرآن کریم تدبر وتفکر پر بڑا زور دیتا ہے۔ وہ قرآن سے اعراض برتنے والوں کے متعلق کہتا ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰى قُلُوۡبٍ اَ قۡفَالُهَا ﴿۲۴﴾ (47:24) ''یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔ کیا انہوں نے اپنے دلوں پر (خود ساختہ) تالے ڈال رکھے ہیں؟'' (نیز 23:68) سورۂ النساء میں ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ وَلَوۡ كَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَيۡرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوۡا فِيۡهِ اخۡتِلَافًا كَثِيۡرًا ﴿۸۲﴾ (4:82) ''کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔ اگر یہ فکر وتدبر سے کام لیتے تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اور یہ بھی اس کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل ہے''۔ سورۂ ص میں ہے: كِتٰبٌ

أَنْزَلْنٰهُ إِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ﴿۲۹﴾(38:29)''یہ مبارک کتاب ہم نے تیری طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس میں غور وتدبر کریں اور صاحبانِ عقل وبصیرت اس سے حقائق پر آگاہ ہوں۔''

ظاہر ہے کہ یہ غور وتدبر کسی خاص دور تک محدود نہیں تھا کہ قرآن پر جس قدر تدبر کیا جانا تھا وہ اس دور میں کیا جاچکا ہے اور اب اس پر مزید غور نہیں کیا جاسکتا۔ تدبر کا لفظ تمام مسلمانوں کے لئے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ جب قرآن قیامت تک کے لئے ضابطۂ راہنمائی ہے تو اس پر غور وفکر کے دروازے بھی ہمیشہ کے لئے کھلے ہیں۔ یہ کہنا کہ غور وتدبر اسلاف تک محدود تھا۔ انہوں نے جتنا تدبر کیا جانا ضروری تھا، کرلیا۔ اب ہمیں ان کی تقلید کئے جانا چاہئے۔ قرآنِ کریم اس تصور اور مسلک کی بڑی شدت سے مخالفت کرتا ہے۔ کیونکہ اس سے عقل وفکر اور علم وبصیرت کے دروازے بند ہوجاتے ہیں اور انسان، انسانی سطح سے گر کر، حیوانی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں ہانکنے والا جدھر چاہے اُسے ہانک کر لے جائے۔ نہ کسی دور میں علم کی راہیں مسدود ہوتی ہیں، نہ قرآن میں غور وتدبر کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسان بلا سوچے سمجھے ان باتوں کو مان لے جو ہمارے ہاں روایتاً چلی آرہی ہیں۔ لیکن سنئے کہ قرآن، مومن کن لوگوں کو قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے: وَالَّذِيْنَ إِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا﴿۷۳﴾(25:73)''مومن وہ ہیں کہ (اور تو اور) جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔ غور وفکر کے بعد اُنہیں قبول کرتے ہیں۔'' اسے کہتے ہیں قرآن کی رُو سے ایمان! یہ وجہ ہے جو وہ، ہم پیدائشی مسلمانوں کو بھی ایمان لانے کے لیے کہتا ہے۔ (4:136)

یہ ہے عزیزانِ من! قرآن کی رُو سے، عقل وفکر اور علم وبصیرت کی اہمیت۔ صدرِ اوّل کے مسلمان اسی طرح ایمان لائے تھے اور تمام معاملات پر اسی انداز سے غور وفکر کرتے تھے۔

اس کے بعد کیا ہوا؟

لیکن اس کے بعد جب حالات نے پلٹا کھایا تو مخالفینِ اسلام نے سب سے پہلے قندیلِ قرآنی کو انسانی تخیلات کے دبیز پردوں سے ڈھانپ دیا۔ جب وہ روشنی بجھ گئی تو اس کے ساتھ

ہی عقل وفکر کی شمعیں بھی گل ہونا شروع ہوگئیں۔اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کا مقصد یہ بتایا تھا:

لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ ---(57:9)

یہ تمہیں جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر (علم وبصیرت کی) روشنی میں لے آئے گا۔

اس کے برعکس طاغوتی قوتوں کا حربہ یہ بتایا تھا: يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ (2:257) ''وہ انہیں روشنی سے تاریکی کی طرف لے جائیں گی۔'' ان قوتوں نے یہی حربہ استعمال کیا۔ اوراس کے لیے انہیں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ انہوں نے کچھ روایات وضع کیں اورانہیں احادیثِ رسول اللہ ﷺ کے نام سے مشہور کردیا اوران کے متعلق عقیدہ یہ وضع کردیا کہ ان کے انکار سے مسلمان دائرۂ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے۔ یہ روایات کس قسم کی ہیں انہیں آپ احادیث کے کسی بھی مجموعہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ میں یہاں دو چار ایسی روایات پیش کروں گا۔ جامع ترمذی، میں حضرت عباسؓ کی ایک روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

چند وضعی روایات:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک 71 یا 72، 73 سال کی راہ ہے اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔

بخاری شریف کی ایک روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ موسم کس طرح بدلتے ہیں۔ کبھی سردی آجاتی ہے۔ کبھی گرمی، تو آپ نے فرمایا کہ:

دوزخ نے اپنے پروردگار سے شکایت کی کہ اے میرے پروردگار! میرے ایک حصے نے میرے دوسرے حصے کو کھالیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دے دی۔ ایک سانس جاڑوں میں، اور ایک گرمی میں۔ پس تم جو سخت سردی دیکھتے ہو تو یہ بھی جہنم کی سانس ہے۔

اسی بخاری میں ہے:

حضرت ابوہریرہؓ، نبی (ﷺ) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک

گروہ بنی اسرائیل کا کھو گیا۔نہیں معلوم کیا ہوا۔میں خیال کرتا ہوں کہ یہ چوہے وہی ہیں کہ جب ان کے سامنے اونٹ کا دودھ رکھا جاتا ہے تو وہ نہیں پیتے اور جب ان کے سامنے بکریوں کا دودھ رکھا جاتا ہے تو وہ پی لیتے ہیں۔

اسی کی ایک اور روایت:

حضرت ابو ہریرہؓ ، نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل برہنہ غسل کیا کرتے تھے۔ایک دوسرے کی طرف دیکھتا اور حضرت موسیٰؑ تنہا غسل کیا کرتے تھے۔تو بنی اسرائیل نے کہا کہ واللہ! موسیٰؑ کو ہم لوگوں کے ساتھ غسل کرنے سے سوا اس کے کچھ مانع نہیں کہ وہ فتق میں مبتلا ہیں۔اتفاق سے ایک دن موسیٰؑ غسل کرنے لگے اور اپنا لباس پتھر پر رکھ دیا۔وہ پتھر ان کا لباس لے کر بھاگا اور حضرت موسیٰؑ بھی اس کے پیچھے پیچھے یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ ''ثوبی یا حجر! ثوبی یا حجر!!'' اے پتھر! میرے کپڑے دے دے۔ یہاں تک بنی اسرائیل نے موسیٰؑ کی طرف دیکھ لیا اور کہا کہ واللہ! موسیٰؑ کو کچھ بیماری نہیں اور پتھر ٹھہر گیا۔موسیٰؑ نے اپنا لباس لے لیا اور پتھر کو مارنے لگے۔ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! حضرت موسیٰؑ کی مار سے اس پتھر پر چھ یا سات نشان اب تک باقی ہیں۔

(ان روایات کے حوالوں کے لیے ادارہ طلوع اسلام کی
طرف سے شائع کردہ کتاب ''مقامِ حدیث'' دیکھئے)

اگر یہ وضعی روایات، احادیث کے مجموعوں میں ہی محفوظ رہتیں تو بھی ان توہم پرستیوں کا دائرہ محدود رہتا۔لیکن اس کے بعد یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ قرآنِ مجید کی بھی وہی تفسیر قابلِ اعتماد ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہے اور یہ وہ تفسیر ہے جو ان روایات کی بنیادوں پر مرتب ہوتی ہے۔یہ تفسیر کس قسم کی ہوتی ہے، میں اس کا صرف ایک نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ تفسیر ابن کثیر ہمارے ہاں کی نہایت قابلِ اعتماد تفسیر قرار دی جاتی ہے۔اس میں حضرت نوحؑ کی کشتی کی تفاصیل بھی دی گئی ہیں جو قرآن میں ہیں۔اس میں کہا گیا ہے کہ:

وہ بارہ سو ہاتھ لمبی اور چھ سو ہاتھ چوڑی تھی۔تین درجوں کی تھی۔ایک میں جانور اور چوپائے تھے۔دوسرے میں انسان، تیسرے میں پرند، جب جانوروں کا گوبر پھیل گیا تو اللہ تعالیٰ نے

حضرت نوحؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ہاتھی کی دم ہلاؤ۔اس کے ہلاتے ہی اس سے خنزیر، نراور مادہ نکل آئے اور وہ میلا کھانے لگے۔ چوہوں نے جب اس کے تختے کترنے شروع کئے تو حکم ہوا کی شیر کی پیشانی پر انگلی لگاؤ۔اس سے بلی کا جوڑا نکلا اور چوہوں کی طرف لپکا۔

کشتی میں جو مخلوق سوار ہوئی تھی اس کے متعلق بھی تفصیل دی گئی ہے۔لکھا ہے کہ نوحؑ کو حکمِ خدا ہوا کہ اپنے ساتھ جاندار مخلوق کی ہر قسم کا ایک ایک جوڑا نر، مادہ، سوار کرالو۔

سب سے آخر میں گدھا سوار ہونے لگا تو ابلیس اس کی دُم کے ساتھ لٹک گیا۔ جب اس کے دو اگلے پاؤں کشتی میں آ گئے اور اس نے اپنا پچھلا دھڑ اٹھانا چاہا تو نہ اُٹھ سکا۔ کیونکہ دُم پر اس ملعون کا بوجھ تھا۔ حضرت نوحؑ جلدی کرر ہے تھے۔ گدھا بہتیرا چاہتا تھا لیکن پچھلے پاؤں چڑھ نہیں سکتا تھا۔ آخر آپ نے فرمایا: آجا! گو تیرے ساتھ ابلیس بھی ہو۔ تب وہ چڑھ گیا اور ابلیس بھی اس کے ساتھ آ گیا۔

(تفسیر ابنِ کثیر، اردو ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی، بارھواں پارہ، ص: 11-10)

یہ ہیں وہ احادیث اور یہ ہیں وہ تفاسیر، جنہیں (آٹھ نو سال تک) پڑھنے کے بعد، ہمارے دارالعلوموں کے طلباء، علماء بن جاتے ہیں۔ ان دارالعلوموں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد، ان طالب علموں کی ذہنی کیفیت کس قسم کی ہو جاتی ہے، اس کے متعلق ہم سے نہیں، انہی کے زمرہ کے ممتاز ترین علماء کی زبان سے سنیئے، مصر کی جامع ازہر کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ وہ دنیا میں قدیم مذہبی تعلیم کی سب سے بڑی درسگاہ ہے۔ اور علامہ جمال الدین افغانیؒ (مرحوم) کے شاگردِ رشید مفتی محمد عبدہٗ (مرحوم) کا نام بھی سن رکھا ہوگا جن کا شمار، ایک مدت تک اس یونیورسٹی کے بلند ترین ارکان میں ہوتا تھا۔ وہ اس یونیورسٹی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"جو شخص ازہر یا اس قبیل کے مدارس میں جتنی مدت تک تحصیلِ علم کرتا ہے اتنی ہی اس میں تحصیلِ علم کی صلاحیت کم ہوتی جاتی ہے۔

(تفسیر المنار، حصہ اوّل، ص: 181)

ان کے شاگردِ رشید، علامہ رشید رضا (مرحوم) اپنے استاد کا یہ قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''ان کا خیال تھا کہ علماء ازہر اور ان کی قسم کے اور بڑے بڑے شیوخ وعلماء وہ لوگ ہیں جن کی اصلاح کی اُمید باقی نہیں رہی۔''

سرسیدؒ:

قلتِ وقت کی بنا پر میں اس وقت اربابِ شریعت تک محدود رہنا چاہتا ہوں، ورنہ اربابِ طریقت نے تو سرے سے دنیا اور اس کے متعلقات کو حرام اور کائناتی علوم کو باطل قرار دے رکھا تھا۔۔۔ (تفصیل اس کی میری کتاب ''تصوف کی حقیقت'' میں ملے گی)۔ یہ تھی بہرحال، ظلمات ـــ گھٹاٹوپ تاریکیوں ـــ کی وہ جہل آفریں فضا جس میں یہ اُمت صدیوں سے ڈوبے چلی آرہی تھی۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کا علم وتحقیق کے متعلق یہ طرزِ عمل ہو، وہ مصافِ زندگی میں دیگر اقوامِ عالم کا مقابلہ کس طرح کرسکتی ہے؟ نتیجہ یہ کہ آبادی، جغرافیائی محلِ وقوع، معدنی ذخائر، ارضی پیداوار کے امکانات وغیرہ کی اکثریت کے باوجود یہ اُمت، ذلت وخواری، اور محتاجی ومحکومی کی زندگی بسر کرتی چلی آرہی تھی۔ ویسے تو اس کی ساری دنیا میں یہی حالت تھی لیکن، ہندوستان میں 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد یہ قریب المرگ ہوچکی تھی۔ لیکن مبداءفیض کی کرم گستری سے عین اس وقت یہاں ایک ایسا بطلِ جلیل پیدا ہوگیا جس نے واقعی مسیحائی کا کام کیا۔ وہ تھا سرسید احمد خان (اعلیٰ اللہ المقامہٗ) سرسید نے سیاسی دنیا میں کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے، وہ سرِ دست میرے موضوع سے خارج ہیں۔ اس نے علمی دنیا میں جو معرکہ آرا انقلاب برپا کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس نے جب اس اُمت کے زوال پر غور کیا تو اس نے دیکھا کہ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جن علوم فطرت (Natural Sciences) اور تسخیرِ فطرت پر اس قدر زور دیا تھا، اس قوم نے انہیں گم کردیا اور ہر قسم کی جہالت اور توہم پرستی کو علم قرار دے دیا۔ چنانچہ اس نے اپنا اولین فریضہ یہ سمجھا کہ قوم کو بتایا جائے کہ قرآنِ مجید نے ان علوم کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ اس زمانے میں فطرت کا لفظ اُن معنوں میں نہیں استعمال ہوتا تھا جن معانی میں یہ اب استعمال ہونے لگا ہے۔ اس زمانے میں انگریزی کا لفظ نیچرؔ ہی اس مفہوم کو ادا کرسکتا تھا، چنانچہ سرسیدؔ نے قرآنِ کریم کی روشنی میں، نیچر کے علوم اور اس کی تسخیر کی

اہمیت کو بہ تکرار و اصرار واشگاف کیا۔ یہ واضح ہے کہ سائنٹیفک انکشافات، انسانی علم کی وسعت کے ساتھ بڑھتے اور (بعض مقامات پر) بدلتے جاتے ہیں۔ اس لئے (سرسید کے زمانے کے بعد) اس سوسال کے عرصہ میں ان میں اکثر تبدیلیاں آچکی ہیں۔ اس اعتبار سے، سرسید نے جو جزئیات اور فروعات پیش کی تھیں، ان میں سے اکثر سے اختلاف کیا جاسکتا ہے ___ اور اس میں ہماری بھی کوئی کاریگری اور ہنرمندی نہیں۔ خود علمِ انسانی کی سطح بلند ہوگئی ہے لیکن اس سر سیّد نے جو اصول پیش کیا تھا اس سے قطعاً اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے بطورِ اصول یہ کہا تھا کہ جب تک مسلمان، قوانینِ فطرت کا علم حاصل کر کے، فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کرتے، زندہ قوموں کی صف میں ان کا شمار نہیں ہوسکتا۔ یہ علوم (اس زمانے میں اور اب بھی) انگریزی زبان میں تھے اس لئے اس نے انگریزی زبان کی تحصیل کو اولین ضرورت قرار دیا۔ اس نے یہ کچھ نظری طور پر ہی نہیں کیا۔ اس کے لیے ایک درسگاہ قائم کر کے، اس کا عملی نمونہ بھی پیش کر دیا۔ اس شمع سے جو شعاعیں بلند ہوئیں اور پھیلیں۔ تو اس نے دور دور تک تاریکی کے پردوں کو چاک کر دیا۔ آج مسلمانوں کی دنیا میں علومِ فطرت کے جس قدر آثار دکھائی دے رہے ہیں وہ اسی مردِ راہ بیں کی دُور نگہی کا صدقہ ہیں۔ اس مسیحا نفس کا ملتِ مرحومہ پر جس قدر احسان ہے اس کا بدلہ ہی نہیں دیا جاسکتا۔ آج ملتِ اسلامیہ میں جس قدر ڈاکٹر، انجنیئر، علوم طبیعیات اور علم الافلاک کے ماہرین اور دیگر دانشور ہیں وہ نخلِ سرسید ہی کے اثمار ہیں۔ اگر سرسید نہ آتا تو ہم آج بھی یہی کہتے کہ اوپر تلے سات آسمان ہیں، ساتویں آسمان پر سات پہاڑی بکرے ہیں جنہوں نے اپنی پشت پر عرشِ الٰہی اٹھا رکھا ہے۔

لیکن جو لوگ صدیوں سے آنکھیں بند کئے تاریکی میں زندگی بسر کر رہے تھے وہ اس روشنی کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔ اربابِ مذہب کی طرف سے سرسید کی مخالفت ہوئی اور سخت مخالفت۔ کفر کے فتوے چاروں طرف سے ہجوم کر کے اُبھر آئے اور جب یہاں کے فتوؤں سے جی نہ بھرا تو مکہ مدینہ سے فتویٰ منگائے گئے جن میں کہا گیا کہ:

> ''یہ شخص ضال اور مضل ہے۔ بلکہ ابلیس لعین کا خلیفہ ہے کہ مسلمان کے اغواء کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کا فتنہ یہود و نصاریٰ کے فتنہ سے بڑھ کر ہے۔

واجب ہے اولی الامر پر اس سے انتقام لینا۔''

(حیاتِ جاوید)

نیچری:

کسی کے خلاف کفر کا فتویٰ عائد کرنے سے پہلے ضروری ہوتا ہے کہ اس پر کسی فرقے کی چٹ چپکا دی جائے۔ سرسید تو فرقہ بندی کے خلاف تھا اس لئے اسے کس فرقہ کی طرف نسبت سے مطعون کرتے؟ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں وہ نیچر پر بڑا زور دیتا تھا اس لئے کہا گیا کہ وہ نیچری ہے اور نیچری کافر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد نیچری ایک فرقہ بنا دیا گیا۔ چنانچہ جو شخص سرسید کے خیالات سے متفق ہوتا اس کے متعلق کہہ دیا جاتا کہ وہ نیچری ہے۔ جس طرح آج کل جسے مطعون کرنا مقصود ہو اس کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ پرویزی ہے۔ بہرحال سرسید کے خلاف کفر والحاد کے فتوؤں کی بوچھاڑ ہوتی رہی اور وہ نہایت صبر اور ضبط سے انہیں برداشت کرتا رہا۔

کفر کے یہ فتوے اس شخص کے خلاف لگائے جا رہے تھے جو اپنے طالب علموں سے کہہ رہا تھا کہ:

> ''یاد رکھو! سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الّا اللہ محمّد رسول اللہ ہے۔ اس پر یقین رکھنے کی بدولت ہماری قوم، ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر تم اگر آسمان کے تارے بھی ہو گئے تو کیا؟ مجھے اُمید ہے تم علم اور اسلام دونوں کے نمونے ہو گے اور جبھی ہماری قوم کو عزت نصیب ہو گی۔''

ہماری نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں مذہب کے خلاف جو بغاوت اُبھر رہی ہے اس کے متعلق آپ کو ہر محراب و منبر سے یہ آواز مسلسل سنائی دے گی کہ یہ سب اس مغربی تعلیم کا نتیجہ ہے جس کا بیج سرسید نے بویا ــــــ انہیں کون بتائے کہ یہ سرسید کی تعلیم کا نتیجہ نہیں۔ یہ نتیجہ ہے اس مذہبی تعلیم کا جس کی رُو سے آپ انہیں بتاتے ہیں کہ بابا آدم کی پسلی چیر کر اس میں سے ان کی بیوی نکالی گئی تھی۔ وہ اس مذہب سے متنفر نہ ہوں گے تو کیا اُسے گلے سے لگائیں گے؟۔۔۔

سرسیدؒ کی تعلیم نے جس قسم کے مسلمان پیدا کئے تھے اس کی ایک مثال، ہفتہ وار ''صدق'' (لکھنؤ) کے مرحوم مدیر، مولانا عبدالماجد دریابادی کی زبان سے سنئے۔ انہوں نے لکھا تھا:

''غالباً 1898ء کا ذکر ہے۔ سرسید کی وفات یا تو ہو چکی تھی یا عنقریب ہونے کو تھی۔ علی گڑھ کی شہرت کرکٹ کے میدان میں ہندوستان گیر ہو چکی تھی کہ ایک کرکٹ میچ، سوسروس والوں کے مقابلہ میں نینی تال میں قرار پایا۔ میچ شروع ہوا اور اتفاق کہ جمعہ کا دن تھا سول سروس ٹیم کھیل رہی تھی اور علی گڑھ کھلا رہی تھی۔ علی گڑھ کے شہرۂ آفاق باؤلر اشفاق باؤلنگ کر رہے تھے۔ ایک مرتبہ جو اشفاق نے گیند پھینکنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو یکا یک نماز جمعہ کی اذان کی آواز کان میں آئی۔ معاً بلاتوقف اس کا اٹھا ہوا ہاتھ، نیچے گر گیا۔ اشفاق نے اتنا بھی نہ کیا کہ باؤلنگ پوری کر لیتا۔ سول سروس والے اس پابندی و احکام پر عش عش کر اُٹھے۔ (طلوع اسلام، جون 1968ء، ص:24)

یہ تھے ''نیچری'' سرسید کی درسگاہ کے تعلیم و تربیت یافتہ نوجوان! فرمائیے؟ سرسید کے خلاف طعن و تشنیع کے تیز برسانے والے ہزار ہاتھ، اشفاق کے اس گرنے والے ہاتھ پر نچھاور کئے جا سکتے ہیں یا نہیں؟ (مطبوعہ، اگست 1982ء)

سرسیدؒ نے علومِ جدیدہ کی تحصیل کی جو اہمیت قوم کے سامنے پیش کی تھی، اس کا تصور تو آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا لیکن اقوامِ مغرب کے لیے وہ کسی خاص خطرہ کا موجب نہیں تھا۔ اب جو مسلمانوں کے مختلف ممالک آزاد ہوئے اور زمانے کے تقاضوں نے ان پر علومِ جدیدہ، بالخصوص سائنٹیفک علوم کی تحصیل کی اہمیت کو شدت سے واضح کیا، تو اس سے ان اقوام کو خطرہ محسوس ہوا، اور انہوں نے سر جوڑ کر اس کے سدِ باب کی تدابیر کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ گہری سوچ اور بچار کے بعد، وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمان مذہب پرست قوم ہے۔ اگر ان میں اس احساس کو شدید کر دیا جائے کہ اصلی اسلام وہی ہے جو ان کے عہدِ ملوکیت میں وضع ہوا اور جو

صدیوں سے متواتر چلا آ رہا ہے۔ اور جدّت پسندیاں، الحاد اور بے دینی کی طرف لے جاتی ہیں، تو یہ خطرہ ٹل سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ان کی اس سکیم کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ ارمغانِ حجاز میں ان کی نہایت اہم نظم ___ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ ___ اقوامِ مغرب کی اسی سکیم کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ میں نے اس سے پہلے بھی کئی بار اس حقیقت کو واضح کیا ہے لیکن آج کل اس نے جو خصوصی اہمیت اختیار کر رکھی ہے اس کے پیشِ نظر اس کا دہرانا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس نظم میں کہا گیا ہے کہ جب ابلیس کے مشیروں نے اس کی توجہ اس خطرہ کی طرف مبذول کی تو اس نے کہا کہ ؎

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

اس پر انہوں نے پوچھا کہ اس خطرہ کے سدِباب کے لیے ہمیں کرنا کیا چاہیے، تو اس نے کہا کہ اس کے لیے پروگرام یہ ہے کہ ؎

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات؟

اس کے لیے کرنا یہ چاہیے کہ اسے اس قسم کے مسائل میں اُلجھائے رکھو کہ ؎

ابنِ مریم مرگیا یا زندۂ جاوید ہے؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جُدا یا عینِ ذات؟
آنے والے سے مسیحِ ناصریؑ مقصود ہے؟
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریمؑ کے صفات؟
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم؟

اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟
تم اسے بے گانہ رکھو عالمِ کردار سے!
تابساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

اور آخر میں اس نے کہا کہ ؂

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیںؔ کی احتسابِ کائنات

اس کے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ ؂

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اِسے!

اقبالؔ نے یہ کچھ 1937ء۔1936ء میں کہا تھا۔ اور اقوامِ مغرب اسی قوت سے اس پروگرام کی پخت و پز میں لگ گئی تھیں۔ میرے پاس وقت نہیں ورنہ میں بتا تا کہ اس تمام دوران میں یہ اقوام کس کس رنگ میں اس پروگرام کو نہایت خاموشی سے اور غیر محسوس طور پر آگے بڑھاتی رہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، پروگرام یہ تھا کہ مسلمانوں کے دل میں اس فریب کو راسخ کر دیا جائے کہ حقیقی اسلام وہی ہے جو مذہب کے نام سے ان کے ہاں مروج چلا آرہا ہے۔ دیںؔ کی طرف دعوت، جو قرآن مجید میں محفوظ ہے، بدعت ہے۔ الحاد ہے۔ بے دینی ہے۔ ان کی یہ سکیم محوِ خرام تو ایک عرصہ سے تھی لیکن گذشتہ دو تین سالوں سے عالمگیر حیثیت اختیار کررہی ہے۔ یہ اس لئے کہ مسلم ممالک بالخصوص پاکستان میں، اسلامی نظام قائم۔۔۔ کرنے کا خیال اُبھرا تو انہیں خدشہ پیدا ہوا کہ اگر یہ بالخصوص پاکستان میں، اسلامی نظام قائم۔۔۔ کرنے کا خیال اُبھرا تو انہیں خدشہ پیدا ہوا کہ اگر یہ نظام علامہ اقبالؒ کے تصور کے مطابق قائم ہو گیا تو ان کا سیاسی اور معاشی نظام تباہ ہو جائے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مسلم اقوام کو اس طرف آنے ہی نہ دیا جائے اور انہیں اس نظامِ کہن کی بھول بھلیوں میں الجھا دیا جائے جو فلاح و بہبود کی راہ ان

کے سامنے کشادہ ہی نہ ہونے دے۔ اس سے پہلے اقوامِ مغرب، مسلمان مذہب پرستوں کو قدامت پرست (Conservatists) اور جہالت پسند (Obscurantist) کہا کرتی تھیں۔ ان القابات میں نفرت اور حقارت پائی جاتی تھی اس لئے انہوں نے اپنے جدید پروگرام کے لیے نام بھی جدید تجویز کیا۔ یعنی (Fundamentalism) اور اس کے داعیوں کو (Fundamentalists) کہہ کر پکارنے لگے۔ ان اصطلاحات کے لئے ابھی تک اردو میں کوئی موزوں اصطلاح تراشی نہیں گئی۔ اس تحریک کو انہوں نے اس قدر پھیلایا ہے کہ قریب قریب ہر مسلمان ملک میں اس کی شاخیں قائم ہیں اور وہاں کے نامور پیشوایانِ مذہب اور قدامت پسند پیشہ ور اس کے ساتھ منسلک ہیں۔ مغرب اپنی تحریکوں کو پھیلانے کے لیے اخراجات کی طرف نہیں دیکھا کرتا۔ اس لئے یہ حضرات دولت لوٹ بھی رہے ہیں اور لٹا بھی رہے ۔۔۔ یہ حضرات بڑے فخر سے اپنے آپ کو فنڈامینٹل ایسٹ کہتے ہیں کیونکہ مولوی کا لفظ قیانوسی سا ہو گیا ہے اور فنڈامنٹلسٹ میں جدّت پائی جاتی ہے۔ جن اقوام نے یہ اختراع وضع کی ہے ان کے ہاں اس کا مفہوم کیا ہے یہ ہم سے نہیں، انہی سے پوچھئے۔ پچھلے دنوں امریکہ کے ایک پروفیسر (Dr. Bruce, B- Laurence) پاکستان آئے ہوئے تھے۔ یہ صاحب، ڈیوک یونیورسٹی، ڈرھم میں ریلیجن کے پروفیسر اور عربی اور اسلامی مطالعاتی پروگرام کے مشیر ہیں۔ ان کا ایک انٹرویو، کراچی کے روزنامہ ڈان کی 11 جون کی اشاعت میں شائع ہوا تھا جس کے دوران ان سے پوچھا گیا کہ ان کے نزدیک فنڈامینٹل ازم کا مفہوم کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ:

> اس تحریک کے ساتھ وابستگان کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ یہ، غیر مسلموں ہی کی نہیں۔ خود اپنے مسلمان بھائیوں کی بھی کسی بات کو برداشت نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا کہ فنڈامینٹل ایسٹ وہ ہے جو اس بات پر مصر ہوتا ہے کہ صرف اس کا نقطۂ نظر اور مسلک صحیح ہے اور باقی سب گمراہ ہیں۔ وہ مصر کے اخوان المسلمین ہوں یا ایران کے مجاہدین ان کا طرزِ عمل متصلب (بے لچک) ہوتا ہے اور کسی دوسرے کی بات ماننے کی ان کے ہاں گنجائش ہی نہیں ہوتی ہے۔

قرآنِ مجید اپنے ہر دعویٰ کو دلائل کی رُو سے پیش کرتا اور مخالفین سے بھی کہتا ہے کہ ھَاتُوْا

بُرۡهَانَكُمۡ (27:64) تم بھی اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل پیش کرو۔ لیکن جہالت اپنے دعویٰ کو تعصب کی بنا پر پیش کرتی، اور دھاندلی سے منواتی ہے۔

اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو، فنڈامینٹل ازم کی مبہم اصطلاح کا فریب دے کر، پھر سے ازمنہ متوسطہ (Medieval Ages) کی طرف لوٹا دیا جائے اور اس اسلام کا احیاء کیا جائے جو ان کے عہدِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

آپ اس پر غور کیجئے کہ اسلام کے نام سے جو قوانین پاکستان میں مرتب ہو رہے ہیں، ان کی بنیاد وہی فقہ اور روایات ہیں جو عباسیوں کے عہدِ ملوکیت میں وضع ہوئیں تھیں۔

پاکستان میں قانون سازی:

پہلے یہاں حدود (سزاؤں) سے متعلق قوانین نافذ کئے گئے جو اُسی فقہ پر مبنی تھے۔ ان کے نفاذ کے چند ہی دن بعد کچھ امریکی صحافی سابق صدرِ پاکستان (ضیاءالحق) سے ملنے کے لئے آئے تو انہوں نے کہا کہ جو اسلامی قوانین آپ نے نافذ کئے ہیں وہ تو تاریخ کے عہدِ بربریت کی یاد تازہ کراتے ہیں۔ صاحبِ صدر نے جواب میں کہا کہ ان کے ساتھ ایسی شرائط وابستہ ہیں جن کی رُو سے نہ وہ قوانین نافذ ہوں گے، نہ کسی کو یہ سزائیں مل سکیں گی۔ آپ غور فرمایئے کہ اس سے دنیا اسلام کے متعلق کیا تصور قائم کرے گی؟ پھر یہاں زکوٰۃ کے متعلق قانون نافذ کیا گیا جس کے خلاف احتجاج ہوا تو فیصلہ کیا گیا کہ ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق خود ہی زکوٰۃ ادا کر دیا کرے۔ وہ اس قانون سے مستثنیٰ ہیں البتہ جو لوگ اپنے آپ کو قرآن کا پابند قرار دیں گے وہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہوں گے۔ رجمؔ (سنگساری) کے خلاف وفاقی شرعی عدالت نے پہلے یہ فیصلہ دیا کہ یہ سزا اسلام کے خلاف ہے۔ اس کی تدوینِ نو کر کے، اسے اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے کہا گیا تو اس نے فیصلہ صادر فرما دیا کہ یہ سزا عین اسلام کے مطابق ہے۔ یعنی چند ہی دنوں کے عرصہ میں، ایک ہی عدالت کی طرف سے اسلام کے متعلق دو متضاد فیصلے صادر ہو گئے۔ دیگر

کئی ایک قوانین بھی زیرِ ترتیب ہیں جن کے متعلق قسم قسم کی باتیں سننے میں آتی ہیں لیکن چونکہ انہوں نے ہنوز قانونی شکل اختیار نہیں کی اس لیے ان کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔

اس تحریک نے کئی نئے نئے فقیہہ، مفتی اور مجدّد پیدا کر دیئے ہیں جن کے پاس اگرچہ قدامت پرست علماء حضرات جتنا علم بھی نہیں لیکن وہ از خود مسندِ افتاء پر بیٹھے، آئے دن اس قسم کے فتاویٰ نافذ کرتے رہتے ہیں کہ فلاں بات بھی اسلام کے خلاف ہے اور فلاں بات بھی۔۔۔ اس کے لیے وہ کسی اتھارٹی کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ان کا ارشاد ہی کسی بات کے اسلامی یا غیر اسلامی قرار دینے کے لیے کافی اتھارٹی ہے۔ معیار بالبداہت یہ ہے کہ جو چیز بھی قرآن مجید اور علم وبصیرت کے مطابق ہو، وہ غیر اسلامی ہے۔ عورتوں کو گھر کی چار دیواری کے اندر نظر بند رکھنا چاہیئے۔ اگر انہیں کسی اشد ضرورت کے لیے گھر سے باہر نکلنا ہو تو اس طرح لپٹے لپٹائے نکلیں کہ ان کی صرف ایک آنکھ دکھائی دے۔ ان کا کسی ایسی جگہ کام کرنا جہاں مرد بھی موجود ہوں، خلافِ شریعت ہے۔ مردوں اور عورتوں کی مساوات کا تصوّر غیر اسلامی اور مغرب سے مستعار لیا ہوا ہے۔ عورتیں پارلیمان کی ممبر نہیں بن سکتیں۔ انہیں یہاں ووٹ کا حق بھی نہیں دینا چاہیئے۔ فوٹو اتروانا خلافِ شریعت ہے۔ (لیکن ٹی وی پر آنا جائز ہے کیونکہ یہ حضرات خود ٹی وی پر آتے اور کثیر معاوضہ پاتے ہیں) چونکہ یہ لوگ (Aesthetic Sense) یعنی فنونِ لطیفہ سے محظوظ ہونے کی حسِ لطیف سے محروم ہوتے ہیں، اس لئے ان کے نزدیک یہ فنون سب ناجائز ہیں۔ حتیٰ کہ قوالی بھی۔ صرف ڈھول اور دف (ڈفلی) کی اجازت ہے۔

یہ ہیں چند مثالیں اس اسلام کی جسے یہ فنڈامینٹل اسٹ رائج کرنا چاہتے ہیں۔ مقصد اس سے (دو لفظوں میں) یہ کہ لِيُطْفِـُٔوا نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ (61:8) تا کہ جو روشنی خدا نے (اپنی کتاب میں) انسانوں کو عطا کی تھی اسے پھونکیں مار مار کر بجھا دیا جائے۔ سرسیدؔ کے یہ سب سے بڑے دشمن ہیں۔

اسلام کے سیاسی نظام کے متعلق ہنوز کچھ فیصلہ نہیں ہوا لیکن ابھی سے اس قسم کی آوازیں اُبھرنی شروع ہوگئی ہیں کہ شخصی حکومت ___ ڈکٹیٹر شپ، ملوکیت، حتیٰ کہ موروثی حکومت بھی عین مطابق اسلام ہے اور اس کی سند یہ ہے کہ، صدرِ اوّل کے مختصر سے عرصہ کے بعد، ہمارے

ہاں ملوکیت (بلکہ موروثی ملوکیت) متواتر چلی آرہی ہے۔آپ نے اس ستم ظریفی پر بھی کبھی غور فرمایا ہے کہ ایک طرف یزیدؔ کے خلاف سب سے بڑا جرم یہ عائد کیا جاتا ہے کہ اس نے حکومت ورثہ میں حاصل کر کے ملوکیت کی طرح ڈالی تھی اور اس طرح اسلام کی جڑ کاٹ کر رکھ دی تھی اور دوسری طرف ان تمام مسلمان بادشاہوں کو جنہوں نے اسی طرح مملکت حاصل کی تھی، صحیح اسلامی حکمران ثابت کیا جارہا ہے اور آج جبکہ زمانے کے تقاضے ہر قسم کی شخصی حکومت کو مٹانے کے درپے ہیں، مسلمانوں میں اس کے احیاء کی کوششیں کی جارہی ہیں۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اقوامِ مغرب کو مسلمانوں کی شخصی حکومتیں زیادہ (Suit) کرتی ہیں اور دوسری یہ کہ ہمارے ہاں اُنہی قوانین کو اسلامی کہہ کر نافذ کیا جارہا ہے، جو ان سلاطین کے عہد میں مدوّن ہوئے تھے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان سلاطین کو اسلامی حکمران قرار دیا جائے تا کہ ان کے عہد میں وضع شدہ قوانین کے اسلامی ہونے کی سند ہاتھ آجائے۔ظاہر ہے کہ فنڈامینٹل ایسٹ سب سے زیادہ مخالفت اس کی کرینگے جو قرآن کی طرف دعوت دیتا ہو۔اس لئے کہ قرآن، ہر قسم کی شخصی حکومت کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔شخصی حکومت کی ہی نہیں بلکہ مغرب کی سیکولر جمہوریت کی بھی۔اس لئے کہ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ۔۔۔کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق ہی حاصل نہیں۔خواہ وہ ایک فرد ہو اور خواہ افراد کا کوئی گروہ۔حکومت صرف خدا کی جائز ہے جس کا عملی طریق، اس کی کتاب (قرآن مجید) کی حکمرانی ہے۔اسی کو ابدی اقدار کی حکمرانی کہا جاتا ہے۔ یہ نکتہ ذرا وضاحت طلب ہے۔قرآن میں ہے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ (97:1)''ہم نے اسے لیلۃ القدر میں نازل کیا۔لیلؔ کے معنی رات کے ہیں لیکن اس سے مراد وہ تاریک دَور بھی ہوسکتا ہے جس کے بعد سحرِ قرآنی کی نمود ہوئی اور دنیا کو روشنی عطا ہوئی۔

مستقل اقدار:

دوسرا لفظ قدر ہے جس کے معنی ہیں پیمانہ یعنی قرآن نے نوعِ انسانی کو حق و باطل کے ماپنے کے صحیح صحیح پیمانے عطا فرمائے۔انہی کو مستقل اقدار (Permanent Values) کہتے ہیں اور یہی درحقیقت دین اور لادینی۔کفر اور اسلام، اسلامی نظام اور سیکولرازم میں حدِ امتیاز ہے۔اسے

غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

زندگی جب ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھتی ہے تو ہر اگلی منزل میں، اپنی پچھلی منزل کے کچھ مضمرات ساتھ لے آتی ہے۔ جب یہ وادیٔ حیوانیت سے منزلِ انسانیت میں داخل ہوئی تو حیوانی زندگی کے کچھ تقاضے اپنے ساتھ لے آئی۔ انہیں جبلی تقاضے یا (Instincts) کہا جاتا ہے۔ ان میں دو تقاضے بڑے اہم ہیں ___ یعنی تحفظِ خویش ___ اور افزائشِ نسل (یعنی جنسی تقاضا)۔ یہ تقاضے حیوانوں اور انسانوں میں مشترک ہیں لیکن ایک بڑے اہم فرق کے ساتھ۔ حیوانات پر فطرت اپنا کنٹرول رکھتی ہے اور انہیں ان کی حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ شیر گوشت کھاتا ہے۔ سبزی اس کے لئے حرام ہے۔ بکری سبزی کھاتی ہے۔ گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی خواہ بھوکوں کیوں نہ مر جائے۔ یا (مثلاً) ایک بیل کے سامنے کتنا ہی چارہ کیوں نہ رکھا ہو۔ جب اس کا پیٹ بھر جائے گا تو وہ اطمینان سے ایک طرف بیٹھ کر جگالی کرنے لگ جائے گا۔ باقی چارے کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھے گا۔ جہاں تک جنسی تقاضا کا تعلق ہے۔ فطرت نے اس پر بڑے محکم (Valve) لگا رکھے ہیں۔ حیوانی نر اور مادہ سارا سال اکٹھے چرتے چگتے رہیں گے۔ ایک دوسرے کی طرف "نظرِ بد" سے دیکھیں گے بھی نہیں۔ لیکن جب اختلاط کا موسم (Mating Season) آئے گا تو پھر، افزائشِ نسل کا فریضہ سرانجام دیں گے اور اس کے بعد، اگلے موسم تک پھر وہی سکوت اور سکون۔ فطرت نے حیوانات کے ان تقاضوں پر اس طرح ویلو لگا رکھے ہیں۔

انسان میں بھی یہ تقاضے موجود ہیں لیکن اسے خدا نے صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے اس لئے ان تقاضوں کے پورا کرنے پر، اس پر فطرت کی طرف سے کوئی کنٹرول عائد نہیں کیا گیا۔ اب آپ سوچئے کہ حیوانات کے مقابلے میں انسان کو لامحدود وسعتیں اور بے پناہ قوتیں دی گئی ہوں، اور اس پر خارج سے کوئی کنٹرول عائد نہ کیا گیا ہو۔ تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ باہمی تصادمات اور تزاحمات کا وہی جہنم جس میں انسان شروع سے جھلستا چلا آ رہا ہے اور جس کے شعلے آج فلک گیر ہو رہے ہیں کیونکہ اس کی امکانی وسعتیں حدود فراموش ہو رہی ہیں۔ انسان کا سارا مسئلہ یہ ہے کہ ان تقاضوں کے پورا کرنے پر کنٹرول کونسا اور کس طرح عائد کیا جائے کہ انسان

میں باہمی ٹکراؤ پیدا نہ ہو۔ انسانی فکر نے، سقراط سے لے کر آج تک اس باب میں ہزاروں تراکیب سوچیں اور طریقے وضع کئے لیکن ان میں سے کوئی بھی کامیاب ثابت نہ ہوا۔ وحیٔ خداوندی نے کہا کہ جس خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے وہی وہ حدود مقرر کرسکتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے ان تقاضوں کو پورا کیا جائے تو کسی قسم کا ٹکراؤ پیدا نہیں ہوسکتا۔ ان حدود کا دوسرا نام اقدار ہے۔ جو قرآن کے اندر آ کر مکمل ہوگئی ہیں اور غیر متبدل ہیں۔ انہی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام اسلام ہے اور جس معاشرہ میں یہ اقدار عملاً کارفرما ہوں اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ اقدار، ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ کسی انسان کو، ان میں کسی قسم کا ردو بدل یا حک واضافہ کرنے کا اختیار نہیں۔ یہ اقدار ان حدود کا کام دیتی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانے کی اُمت مسلمہ باہمی مشاورت سے جملہ امورِ مملکت طے کرتی ہے۔ ان۔۔۔ اقدار کے مطابق جو معاشرہ قائم ہوتا ہے اس میں نہ انسانوں کی کسی قسم کی حکومت بار پا سکتی ہے، نہ ہی نظام سرمایہ داری یا مذہبی پیشوائیت، غیر مسلم طاقتیں اس لئے اس نظام کی مخالفت کرتی چلی آرہی ہیں۔ اس کا طریق انہوں نے یہ اختیار کر رکھا ہے کہ چند نظری مسائل اور فقہی احکام کا نام اسلام رکھ دیا جائے اور اُمت کو ان مباحث میں اُلجھا دیا جائے۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے ان اقوام کو سب سے زیادہ خطرہ پاکستان سے تھا کیونکہ اسی سرزمین میں سرسیدؒ اور اقبالؒ کی روشن کردہ قرآنی قندیلیں درخشندہ ہیں اور انہیں ڈر ہے کہ یہاں وہ نظام قائم نہ ہو جائے۔ اس لئے فنڈامینٹل ازم کی یلغار کا نمایاں رخ اسی خطہ کی طرف ہے۔ لیکن یہ وقتی اور ہنگامی جھکڑ ہیں جو تیرہ سو سال سے چلتے آرہے ہیں۔ یہ قرآنی شمع کو (خدانکردہ) گل نہیں کرسکتے، اس لئے کہ خدا کا وعدہ اور اعلان ہے کہ:

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۳۳ (9:33)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطہ ٔ راہنمائی اور حق پر مبنی دین (نظام) دے کر بھیجا۔ اس نظام کو دنیا کے ہر نظام پر غالب آ کر رہنا ہے۔ خواہ یہ بات ان لوگوں کو کتنی ہی گراں کیوں نہ گذرے جو خدا کے ساتھ انسانوں کو بھی حقِ حکومت دیتے ہیں۔

جس خدا نے نزولِ قرآن کی ابتداء ''اقدار کی رات'' میں کی تھی اس نے وہیں کہہ دیا تھا کہ اس کی روشنی پھیلے گی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مِنۡ كُلِّ اَمۡرٍ ۛ سَلٰمٌ ۛ (97:5-4) کائنات کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر شعبے سے سلامتی کی آوازیں وجہ ٔ فردوسِ گوش ہوں گی۔ هِيَ حَتّٰى مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ (97:5) تا آنکہ رات کی تاریکیاں چھٹ کر ساری فضا صبح کی نورانیت سے معمور ہو جائے گی۔ یہ نورانیت سب سے پہلے عہدِ محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ میں وجہ ٔ تابانی عالم ہوئی تھی جس سے زندگی کے تاریک سے تاریک تر گوشے بھی چمک اٹھے تھے۔ وہ انقلاب ہنگامی طور پر(By Revolution) ظہور میں آیا تھا۔ اس کے بعد یہ انقلاب ارتقائی طور پر(By Evolution) رونما ہوگا جب انسان اپنے غلط تجارب کے ہلاکت آفریں نتائج سے تنگ آ کر، قرآن کے بتائے ہوئے راستے کی طرف آئے گا۔ آپ یہ معلوم کر کے متعجب ہوں گے کہ جن قوموں کے سیاسی اور معاشی تقاضے مسلمانوں کو فنڈامینٹل ازم جیسی تاریکیوں کی طرف لے جانے کی سازشیں کر رہے ہیں، انہی اقوام کے اربابِ دانش قرآنی نظام کی تلاش میں مضطرب و سرگرداں ہیں۔ لہٰذا، قرآنی نظام کا قیام تو نوعِ انسان کا مقدر ہے۔ اقبالؒ نے بہت پہلے کہا تھا کہ ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نور ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی، آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

ظاہر ہے کہ اس سحر کی نمود اس قوم میں ہوگی جو قرآنی حقائق کو علم و بصیرت کی رُو سے سمجھنے کی کوشش کرے گی ___ جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق استعمال میں لائے گی۔ ان میں پہلی قدر یہ ہے کہ کوئی انسان رات کو بھوکا نہ سوئے اور دوسری قدر یہ کہ کسی انسان کی کسی طور بھی تذلیل نہ ہو۔

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں، ایں است و بس

(مطبوعہ، اگست 1982ء)